بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

عہدِ حاضر میں مادّیت کی اندھی بہری قوت نے مذہب، اخلاق یا خود انسانیت کا جو حشر کیا ہے اُس کا ہلکا سا تصور انگریزی محاورے (BULL IN A CHINA SHOP) یا اُردو کے مصرع "دیوانہ جیسے کارگہِ شیشہ گر میں ہو" سے بآسانی کیا جا سکتا ہے۔ مادیت کے اس دیوِ استبداد نے ایک "خود سر اور منہ زور سانڈ" یا بپھرے ہوئے دیوانے کی طرح انسانی اخلاق کے نوامیسِ عالیہ کو اپنی جولانگاہ بنا کر تہذیب و شرافت کے سارے نازک آبگینوں کو توڑ دیا ہے۔

انسانیت کے "مغربی پاسبان" توڑ پھوڑ اور بربادی کے اس المیہ کو ایک مدت تک طربیہ سمجھ کر فرحت و انبساط کے ملے جلے جذبات کے ساتھ اسے دیکھتے رہے۔ انہیں یہ معلوم کر کے گوناگوں مسرت ہوتی کہ انسانیت نے اخلاق اور صداقت جیسی بیش قیمت صفات کا جو خزانہ صدیوں سے محفوظ کر رکھا تھا اور جسے ہر نسل بڑے فخر کے ساتھ اپنی بعد میں آنے والی نسل کو بطور ایک "مقدس اور قیمتی ورثہ" کے منتقل کرتی اُسے قوت کے اس پیکر نے بالآخر نہایت کامیابی کے ساتھ تباہ کر دیا ہے۔ اُسے یہ جان کر دلی راحت ہوتی کہ ضمیر اور وجدان کے صاف اور شفاف آئینے جو آدمیت کے چاروں طرف آویزاں تھے اور جن میں اُس کے افکار و اعمال کی مختلف شکلیں منعکس ہو کر اُسے اپنی حقیقت اور اپنے مقام سے آگاہ کرتیں وہ اب اُس کی بے رحم ٹھوکروں سے شکستہ ہو چکے ہیں اور خوش قسمتی سے اب ان میں کوئی چیز بھی ایسی باقی نہیں رہی جو اس کے نازک احساسات یا لطیف جذبات کو بیدار کرے یا اس کی روح کو مضطرب اور ضمیر کو بے چین کر کے اس کے

دل کی دنیا کو زیر و زبر کر دے۔

ایک طرف انسانیت بربادی کے اس تماشہ کو پورے سکونِ خاطر کے ساتھ دیکھ رہی تھی اور دوسری طرف "مادیت کا عفریت" اپنے کارناموں اور فتح مندیوں پر اتنا بدمست ہو گیا تھا کہ اُس نے خود انسانیت کے قصر کی دیواریں ہی منہدم کرنا شروع کر دیں اور اس کے اندر رہنے والوں کو ایسی کاری ضربات لگائیں کہ اُن کی خوشی بہت جلد کافور ہو گئی اور وہ درد سے کراہنے لگے۔ کرب و اضطراب کی یہ آہیں اوّل اوّل کمزور اور خفیف تھیں۔ لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ جن سینوں سے یہ ٹیسیں اٹھ رہی تھیں ان میں ان زخموں کی تکلیف کا احساس کم تھا۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اس تہذیب کے اوّلین مقتولین بھی مادیت کے اس دیو سے اسی بے رحمی کے ساتھ مجروح ہوئے جس طرح کہ بعد کے لوگ ہوئے ہیں۔ اس کے پہلے وار بھی اتنے ہی کاری اور مہلک تھے جتنے کہ آج کے ہیں۔ فرق اگر کچھ ہے تو صرف یہ کہ کل کے لوگوں پر آج کی بہ نسبت تہذیبِ جدید کا سحر زیادہ تھا۔ وہ اس کے وار پر وار سہتے مگر اُن کا ذہن کبھی یہ بات باور کرنے پر آمادہ نہ ہوتا کہ یہ سب اسی مادیت کا "فیضِ عام" ہے۔ یورپ کا احساسِ نخوت پوری ایک صدی تک اپنے تہذیبی طلسمات سے کھیلتا رہا اور اُس نے بڑی ہوشیاری کے ساتھ اپنی تہذیب کی کمزوریوں سے صرفِ نظر کیا۔ یہ صورتِ حال پوری ایک صدی تک قائم رہی۔ اس دوران میں شاید ہی کوئی دن ایسا گزرا ہو جس میں اس تہذیب کی خامیاں بے نقاب نہ ہوئی ہوں۔ یورپ کے اہلِ خرد جن چیزوں کو پہلے پہل رجعت پسندوں کی "خام خیالیاں" کہہ کر نظر انداز کرتے رہے وہ اب اتنے ٹھوس حقائق کی شکل میں سامنے آ رہی تھیں کہ اُن کے ساتھ تغافل کا سا پہلا انداز اختیار نہ کیا جا سکتا تھا۔ چنانچہ اب ان پر کافی آزادی کے ساتھ لب کشائی کی جا رہی ہے اور کبھی کبھی یہ لب کشائی ایک گہرے درد کی نشاندہی کرتی ہے۔

جدید انسان کا حال اُس شرابی کا سا ہے جو ایک عرصہ تک شراب کے نشے میں بدمست ہو کر اپنی نازک اور قیمتی سے قیمتی اشیاء کی بربادی بڑی خوشی کے ساتھ دیکھتا رہا، بلکہ آگے بڑھ کر اپنے تن بدن کو بھی اسس دیوانگی کی یلغار کے سامنے پیش کرتا رہا۔ لیکن اب جب کہ درد کی شدت نے اس کا نشہ کافی حد تک اتار دیا ہے تو وہ ایک طرف تو زخموں کی تکلیف سے کراہ رہا ہے اور دوسری طرف اپنے اُس "بیش قیمت" ورثہ کے زیاں پر نوحہ خواں ہے جو صدیوں سے اُس کا سرمایۂ افتخار چلا آرہا تھا اور اب وہ کوڑے کے اس ڈھیر میں سے ڈھونڈ ڈھونڈ کر ضمیر و اخلاق کے ٹوٹے ہوئے آبگینے تلاش کرتا ہے تاکہ انہیں جوڑ کر وہ پھر سے قصرِ انسانیت ان سے آراستہ کرے اور ان میں اپنی شکل و صورت دیکھ کر معلوم کرے کہ وہ کس حالت میں ہے۔

یہ احساس اب یورپ میں اتنا عام ہو رہا ہے کہ آپ کسی مفکر کی تصنیف اٹھا کر مطالعہ کریں تو آپ کو اس میں اسی قسم کے احساسات جھلکتے ہوئے دکھائی دیں گے۔ یہاں اتنی گنجائش نہیں کہ اس قسم کے احساسات کا کوئی مرقع پیش کیا جا سکے۔ ہم یہاں صرف مثال کے طور پر چند "اہلِ نظر" کے خیالات پیش کرتے ہیں۔ ان میں پہلا شخص پروفیسر آرنلڈ جے۔ ٹائن بی (ARNOLD. J. TOYNBEE) تاریخِ انسانی کا ایک عظیم المرتبت عالم ہے۔ اس نے ۱۹۴۹ء میں ایک مشہور جریدہ ورلڈ ریویو میں انسان کی اس کیفیت کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

> "عہدِ حاضر کے انسان کا حال جوئے کے اس کھلاڑی کا سا ہے جس نے اپنا داؤں بڑھاتے بڑھاتے یہاں تک پہنچا دیا ہے کہ اس کا بنک اکاؤنٹ، اس کی معاش اور اس کی زندگی سب بساط پر رکھے ہیں۔ یہ عمل بڑا خطرناک ہو رہا ہے۔ وہ سوچتا ہے کہ اسے بازی مار لینی چاہیے لیکن اُسے اپنے پتوں اور اپنے ہنر پر بھروسا ہرگز نہیں رہا کہ اُن کے بل پر اس کی کامیابی یقینی ہو۔

"فنی کمالات بجائے خود حکمت بقا کے لیے کوئی ضمانت نہیں ہیں۔ تمدن جب

کبھی خود اپنی فنی مہارتوں کے دلدادہ ہو کر رہ گئے ہیں تو اس وقت انہوں نے ایک قدم خودکشی کی طرف بڑھا دیا ہے۔ بعید نہیں کہ تمدن اس قسم کے رجحان کا رخ بدل لیں اور از سر نو پنپ سکیں لیکن یہ صرف اسی صورت میں ممکن ہے کہ وہ آلات پر نگاہیں مرتکز کرنا چھوڑ دیں۔"

"جن ۲۱ تمدنوں کا میں نے مطالعہ کیا ہے، ان کو پلٹ کر دیکھتے ہوئے انسان کی قابلیت سے یہ توقع نہیں کی جاسکتی کہ وہ دنیاوی فوائد کو اپنا منتہائے مقصود قرار دینے کے بعد بھی پھر کوئی خوش آئند اخلاقی فیصلے کر سکتا ہے۔ ہاں نوع انسانی کی محبت ایک تاریخی طاقت ہے لیکن وہ بھی صرف اسی حالت میں جبکہ وہ فطری نتیجہ ہو خداوند تعالیٰ سے گہری محبت کا۔ پس دورِ حاضر کی بڑی بھاری ضرورت ایک فوق الطبیعی ذات پر ایمان کا احیا ہے۔"

ایک اور مفکر ڈاکٹر الیکس کیرل نے مغربی تمدن کے بارے میں ایک ناقدانہ کتاب "انسان نامعلوم" پیش کی ہے۔ اس میں بھی اسی قسم کے خیالات ملتے ہیں۔ وہ کہتا ہے:

"مشینی ایجادات میں اضافہ کر دینے سے حالات کو کچھ بھی بہتر نہیں بنایا جاسکتا۔ اسی طرح اس معاملے میں طبیعیات، فلکیات اور کیمیا کے انکشافات کو بھی اتنی زیادہ اہمیت نہیں دی جاسکتی۔ آدمی کو اب توجہ خود اپنے اوپر اور اپنی ذہنی اور اخلاقی پستی کی طرف کرنی چاہیے۔ اپنے تمدن میں لذت، تعیش، جمالیت، اور پیچیدگیاں بڑھاتے چلے جانے سے کیا حاصل جبکہ اس تمدن کو اپنے حقیقی مفاد کے رخ پر لے جانے میں خود ہماری اپنی کمزوریاں مانع ہو رہی ہیں۔ درحقیقت یہ کوئی مفید صورت نہیں ہے کہ ایسے طریقہائے زندگی کے بنانے میں جان کھپائی جائے جو اخلاقی زوال کا اور عظیم نسلوں کے صالح عناصر کے خاتمے کا موجب ہو رہا ہے۔ زیادہ سے زیادہ تیز رفتار بحری جہاز، زیادہ آرام دہ گاڑیاں، سستے ریڈیو اور بعید تر سحابیوں کا مشاہدہ کرنے کے لیے دوربینیں بنانے چلے جانے سے کہیں زیادہ بہتر یہ ہوگا کہ ہم "خودنگری" کی عادت ڈالیں۔"

پروفیسر سوروکن انسانیت کی اس کس مپرسی کا رونا ان الفاظ میں روتا ہے:۔

"موجودہ نظام کے حسی اخلاقیات نے انسان کو کافی حد تک ذلیل کر دیا ہے۔ اخلاقی قدریں بالکل مٹ گئی ہیں۔ ان کی حیثیت آج اس کے سوا کچھ نہیں کہ اگر ان سے کسی کو کوئی فائدہ پہنچے تو ان کو قبول کیا جا سکتا ہے اور اگر وہ اس راہ میں مزاحم ہوں تو ان کو بلا تکلف ترک کر دیا جاتا ہے۔ انسان نے آج مصلحت پسندی کو اپنا شعار بنا لیا ہے اور اس طرح اس نے دنیا میں مستقل کشمکش اور عناد کے بیج بو دیئے ہیں"

اسی طرح مشہور اطالوی مفکر کروشے اپنی کتاب سیاست اور اخلاق میں لکھتا ہے:

"انسانیت پر کئی بار اس سے پیشتر بھی یاسیت کی پرچھائیں پڑیں اور وہ پہلے بھی شک اور مایوسی کا شکار ہوئی مگر دور جدید میں یہ مرض مہلک نظر آتا ہے فلاسفہ یا وہ لوگ جن کی نگاہیں دور رس ہوتی ہیں وہ فلسفیانہ اور تاریخی حقائق کی بنا پر یہ پیشگوئی کر رہے ہیں کہ انسانیت کا قافلہ نہایت ہی خطرناک اور مہیب غاروں کی طرف جا رہا ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ ہم یہ سمجھ بیٹھے ہیں کہ اس کائنات میں صرف ایسی قوتیں ہی کارفرما ہیں جو تمام تر خارج میں واقع ہیں اور بندھے ٹکے قوانین کے مطابق مصروف عمل ہیں۔ ان قوتوں کے مقابلہ میں ہم اپنے آپ کو بے بس پاتے ہیں"

پروفیسر سی۔ ای۔ ایم جوڈ اپنی کتاب "رہنمائے فسق جدید" میں اسی قسم کے احساسات کا مندرجہ ذیل الفاظ میں اظہار کرتا ہے:

"دانشمندی ایک اخلاقی وصف ہے، یہ یقیناً ایک قسم کا علم ہے ــــ ایک ایسا علم جو صحیح مقاصد کی طرف انسان کی رہنمائی کرے۔ اس لیے جو چیز ہمیں درکار ہے وہ یہ ہے کہ ہم لوگوں کو اس بات پر آمادہ کریں کہ وہ صحیح مقاصد کو اپنائیں۔ دوسرے الفاظ میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ لوگ اخلاقی اعتبار سے بہتر ہوں . . . . . .

ہماری تہذیب کا بنیادی مسئلہ درحقیقت تنظیمی نوعیت کا نہیں بلکہ سراسر اخلاقی نوعیت رکھتا ہے"

مغربی ائمہ کی پیروی میں اب مشرق کے الحاد و مادہ پرستی کے علمبرداروں نے بھی مادی تہذیب کے بارے میں اسی قسم کے خیالات کا اظہار شروع کیا ہے۔ چنانچہ آج سے کچھ مدت پیشتر پنڈت جواہر لال نہرو کا ایک مضمون "بنیادی رویہ" ہندوستان کے اخبارات میں شائع ہوا جس میں اسی قسم کے خیالات کی جھلک ملتی ہے۔ انہوں نے اس میں لکھا ہے:

"انسان کا دماغ آج جس طرح رفتہ رفتہ طبیعیاتی رازوں کو دریافت کرتا چلا جارہا ہے وہ آج کی سب سے حیران کن خصوصیت ہے۔ انسان آج کم سے کم ایک بڑی حد تک خارجی حالات کا شکار ہونے پر مجبور نہیں ہے، ایک طرف خارجی حالات کی تسخیر کا یہ سلسلہ جاری ہے، دوسری طرف مجموعی طور پر انسان کے اخلاق اور ضبطِ نفس میں کمی واقع ہوئی ہے۔ میدانِ طبیعیات کا فاتح خود اپنے نفس پر قابو پانے سے قاصر ہے۔"

"ہمارے زمانہ کی داخلی کشاکش اور خلفشار کا یہی سبب ہے کہ ایک طرف سائنس اور ٹکنالوجی کی یہ زبردست ترقی اور اس کے نتائج ہیں، دوسری طرف خود تہذیب ایک خاص ذہنی تھکاوٹ میں مبتلا نظر آتی ہے۔"

"مذہب اور عقل میں تصادم ہے، مذہب اور رسوم و روایات کی پابندیاں اٹھتی جارہی ہیں لیکن کوئی اخلاقی یا روحانی پابندیاں ان کی جگہ نہیں لے رہی ہیں، مذہب عملی شکل میں یا تو ان معاملات سے تعلق رکھتا ہے جو ہماری عام زندگیوں سے علاقہ نہیں رکھتے یا ایسی رسوم و روایات سے بندھا ہوا ہے جو موجودہ دور سے مطابقت نہیں رکھتیں۔ دوسری طرف عقلیت پسندی اپنی تمام خوبیوں کے باوجود کسی نہ کسی وجہ سے صرف چیزوں کی سطح کو دیکھتی معلوم ہوتی ہے اور اندر کی اصل چیز کو نہیں پاتی۔"

تہذیبِ مادیت کے متعلق ان مفکرین کے خیالات جنہوں نے خود اسی تہذیب کی گود میں پرورش پائی ہے اس حقیقت کے آئینہ دار ہیں کہ اب انسان پھر سے اخلاق اور شرافت کے متعلق غور کرنے

پر مجبور ہوا ہے۔ جن چیزوں کو وہ ایک صدی سے زیادہ "دورِ جاہلیت کی یادگار" یا "بیکار کی زنجیریں" خیال کرتا رہا، اب ان کی وہ خود ضرورت محسوس کر رہا ہے۔ ٹھوس حقیقتوں کے دباؤ نے ان بڑے بڑے منکروں کے انکار کو اقرار سے بدل دیا ہے۔ یہ احساسات ایک نئے اخلاقی انقلاب کی ضرورت کا پتہ دیتے ہیں۔ دنیا کا شاید ہی کوئی ملک ایسا ہو جس کے رہنے والوں میں اس قسم کے جذبات نہ ابھر رہے ہوں۔ انسان اب ہر جگہ یہ محسوس کر رہا ہے کہ محض مادی زندگی اس کے تحفظ و بقا کی ضمانت نہیں ہو سکتی۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ ایک ایسا ضمیر پیدا کرے جو خدا شناس اور خدا ترس ہو، جو صاحبِ یقین و صاحبِ عزم ہو، جس کے اندر اخلاقی حس بیدار ہو، جس کو بغیر کسی خوف اور خارجی خطرہ کے خیانت، ظلم اور گناہ سے نفرت ہو۔ انسان جب تک ان صفات سے متصف نہیں ہوتا دنیا کی کوئی بڑی سے بڑی مادی طاقت بھی اُسے ہلاکت سے نہیں بچا سکتی۔

مادیت کے پرستاروں میں "خود نگری و خود نگری" کا یہ جذبہ اور اخلاق و شرافت کا یہ احساس اُبھرتے دیکھ کر انسانیت کے ہر بہی خواہ کو اس سے دلی مسرت محسوس ہوتی ہے اور وہ یہ سمجھتا ہے کہ دنیا نے چونکہ اب فتنہ کی اصل جڑ کو پالیا ہے اس لیے اس کی اصلاح کی صورتیں بھی اب آسانی سے نکل آئیں گی۔ لیکن جذبات اور احساسات خواہ کتنے ہی پاکیزہ ہوں اُس وقت تک مفید اور کارآمد نہیں ہوتے جب تک انہیں فکر و عمل کے سانچوں میں ڈھال نہ لیا جائے اس لیے اس مرحلہ پر ایک چیز جو ہر سوچنے اور سمجھنے والے دماغ میں پیدا ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ آخر انسانیت کی ان مقدس آرزوؤں اور نیک تمناؤں کی اس آب و گِل کی دنیا میں تکمیل کس طرح ہو سکے گی۔

انسانیت جس ڈگر پر اس وقت جارہی ہے وہ سراسر مادی ہے۔ بنیادی فلسفۂ حیات سے لیکر فکر و عمل کی معمولی سے معمولی جزئیات تک سب میں نہ صرف مادیت ایک غالب عنصر کی حیثیت سے شامل ہے بلکہ انا ولا غیری کے ہمہ گیر دعویٰ کے ساتھ فرمانروائی کر رہی ہے۔ انسانی عمل کا کوئی گوشہ

اس کے مستبدانہ اثر سے آزاد نہیں تھی کہ زندگی کے خالص وہ حصے جنہیں جذبات اور احساسات کہا جاتا ہے اور جن کے بارے میں انسان عام طور پر یہی سوچتا چلا آیا ہے کہ من کی اس دنیا میں "سوز و مستی" "جذب و شوق" کے علاوہ اور کسی چیز کا عمل دخل نہیں ہو سکتا وہاں بھی مادیت نے پوری طرح پر اپنا تسلط قائم کر لیا ہے۔ مادیت کے اس ہمہ گیر نظام کو زندگی کی اساس مان کر روحانیت اور اخلاق کی باتیں کرنا اگر خود فریبی نہیں تو میر کی سی سادگی ضرور ہے۔

جو لوگ بھی اس طرز فکر کے حامی ہیں وہ یہ سمجھتے ہیں کہ انسانیت نے مادیت پر ایمان لا کر کوئی بہت زیادہ ٹوٹے کا سودا نہیں کیا ہے بلکہ بنیادی طور پر اُن کا طرز عمل بالکل صحیح اور انسانیت کے حق میں مفید ہے۔ انسانی ترقی کے لیے یہ بالکل ناگزیر ہے کہ انسان اپنے طبیعی ماحول پر فتح و کامرانی حاصل کرے۔ اسی سے انسان مادی ماحول کی جکڑ بندیوں سے آزاد ہو کر ایک بہتر اور شاد کام زندگی بسر کر سکتا ہے۔ اپنے اس مادی نظریۂ حیات کی صداقت پر وہ ایجادات و اکتشافات کی دنیا میں انسان کی محیر العقول ترقی اور اس سے پیدا شدہ نتائج کو بطور گواہ پیش کرتے ہیں اور بڑے ہی بلند بانگ دعووں سے کہتے ہیں کہ کیا سائنس کی ان ترقیوں سے انسان کے مادی آرام و آسائش میں اضافہ نہیں ہوا؟ کیا طریق پیدائش کی نئی نئی گرہیں کھلنے سے انسان کو فراوانی میسر نہیں آئی؟ کیا ہوا کے تموج اور ذرات کو نامہ و پیام کا ایلچی بنا کر اور ہوا کے دوش پر سوار ہو کر انسان نے زمان و مکان کی حد بندیوں کو توڑ نہیں ڈالا؟ تہذیب مادیت کے علمبرداروں کو اپنی ان کامیابیوں پر بڑا ہی غرور اور ناز ہے۔ اسے وہ مادی فلسفۂ حیات کی ایک زبردست فتح خیال کرتے ہیں۔ البتہ جب کبھی اس راہ میں آگے بڑھتے ہوئے انہیں کوئی الجھن پیش آتی ہے تو پھر وہ بطور اساسی نظریۂ حیات کے نہیں بلکہ بطور عاجزی اور درماندگی یا ایک وقتی ضرورت کے اخلاق، خدا ترسی یا خدا خوفی کا ذکر شروع کر دیتے ہیں مگر اُن کی ترقی کی راہیں بالکل وہی ہیں جو مادیت نے ان کے لیے کھولی ہیں، یہی ایک نصب العین ہے جو انہیں سب سے زیادہ محبوب ہے۔ اخلاق اور خدا بھی اگر کوئی اہمیت رکھتے ہیں تو صرف اسی

حد تک قرآن کی مادی زندگی کے پیچیدہ مسائل کو سلجھانے میں ان سے کسی قدر کام لیا جا سکے۔ لن ٹونگ کی یہ بات تہذیب جدید کے بارے میں کس قدر صحیح ہے جب وہ یہ کہتا ہے کہ اگر آج کا انسان "بہشت بریں" کے بارے میں بھی سوچتا ہے تو اُس کے ذہن میں جنت کا نقشہ بھی اس کے سوا کچھ نہیں ہوتا کہ یہ ایک ایسا گودام ہے جو مادی اسباب سے سراسر بھرا ہوا ہے۔ یہی حال اخلاق اور خدا کا ہے۔ آج اخلاق وہ قابلِ قبول ہے جس سے انسان کو زیادہ سے زیادہ مادی آرام و آسائش میسر آئے اور روحانیت وہ صحیح ہے جو انسانیت کا تزکیہ کر کے اُسے مادیت کے معاملہ میں یکسو کر دے اور پرستش کے لیے بھی ایک ایسا خدا مطلوب ہے جو اسے دولت اور ثروت سے نہ صرف سرفراز فرمائے بلکہ ان سے لطف اندوز ہونے کا سلیقہ بھی اُسے ہر آن بتاتا رہے۔ اس ذہنی پس منظر کے ساتھ یا ان جذبات اور احساسات کے ہوتے ہوئے کسی روحانی نظام یا کسی اخلاقی طرزِ فکر پر کبھی بھی انسانیت کو ایسا اعتماد نہیں ہو سکتا جو اس کے فکر و نظر کے سارے زاویوں کو یکسر تبدیل کر کے اُس کی پوری زندگی کی بالکل نئے انداز سے صورت گری کرے۔

انسانیت اگر اخلاق یا روحانیت کی اس وقت محتاج ہے تو گرمیٔ گفتار یا زیب داستاں کے لیے نہیں بلکہ عملی زندگی کے مسائل حل کرنے کے لیے۔ اس لیے اگر فی الحقیقت ہم مادیت سے بیزار ہو چکے ہیں اور اخلاق پر حیاتِ انسانی کی تعمیرِ نو کا عزم رکھتے ہیں تو پھر اس کے سوا ہمارے پاس کوئی چارہ کار نہیں کہ ہم مادی فلسفۂ زندگی کو حیاتِ انسانی کے سارے گوشوں سے خارج کر دیں اور اس کی جگہ اخلاق یا روحانیت کو مسلط کریں۔ دوسرے لفظوں میں اس بات کو یوں کہا جا سکتا ہے کہ ہم مادیت کی یکسر نفی کریں اور مذہب اور اس کی اقدار کا اثبات کر کے ان پر اپنی پوری زندگی کی عمارت اٹھائیں۔ یہی چیز انسانیت کے لیے فیصلہ کن اہمیت رکھتی ہے اگر انسان نے طویل اور تلخ تجربات کے بعد مادیت پر سے اپنے یقین اور ایمان کو ختم نہیں کیا اور وہ حیاتِ انسانی میں فکر و عمل کا حقیقی سرچشمہ ابھی تک مادیت کو خیال کرتا ہے تو یہ صورت کچھ

زیادہ حوصلہ افزا نہیں کیونکہ زندگی میں اصل اور حقیقی چیز بنیادی فلسفہ حیات یا اعتقاد و ایمان ہے اور جب تک انسانیت پورے شعور اور عزم کے ساتھ مادیت کی جگہ روحانیت یا اخلاقیت کو بحیثیت ایک نصب العین، ایک بنیادی محرک یا غایت الغایات کے تسلیم نہیں کرتی اس وقت تک ان چیزوں کے تذکرے خواہ کتنے ہی دلکش اور مسحور کن ہوں وہ "ذہنی بازیگری" سے زیادہ کچھ اہمیت نہیں رکھتے۔

اس ایک صورت کے علاوہ جتنی صورتیں بھی اختیار کی جائیں گی وہ انسانیت کے لیے مفید اور کارآمد ہونے کی بجائے نقصان دہ اور ضرر رساں ثابت ہوں گی۔ ایک صورت جو اس سلسلہ میں ممکن ہے وہ یہ ہے کہ انسانیت پر تسلط اور فرمانروائی تو مادیت کی رہے البتہ اس کے ساتھ روحانیت کا بھی پیوند لگا دیا جائے بعض اہل فکر اس تجویز کو بڑی ہی معقول سمجھتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ اس سے ایک طرف تو انسانیت ان مادی ترقیوں سے بہرہ مند ہو گی جو اس نے اب تک مادیت پر ایمان لا کر حاصل کی ہیں اور اس راستہ پر چل کر جو کچھ اس نے کھویا ہے اُسے وہ روحانیت کے اپنانے سے حاصل کر لے گی۔ اس تجویز سے زیادہ ناقابل عمل اور مضحکہ خیز کوئی اور چیز نہیں ہو سکتی۔ اول تو متناقض عناصر کا یہ اجتماع ہی بالکل محال اور ناممکن ہے۔ بالفرض اگر اس کے لیے کوشش بھی کی جائے تو پھر یہ فیصلہ کرنا بڑا مشکل ہو گا کہ ان دونوں عناصر سے جو مرکب تیار کیا جائے اُس میں یہ دونوں اجزا کس نسبت سے شامل ہوں تاکہ یہ معجون انسانیت کو پوری طرح شفا دے سکے۔

پھر اس قسم کی تجاویز سوچنے والے افراد اپنی ذہانت اور قابلیت کے باوجود اس ایک سادہ سی حقیقت کو نہیں سمجھتے کہ بے جان مادہ کے اجزا کو آپس میں جمع کرنا اور مختلف افکار اور نظریات کو یکجا کرنے میں بڑا فرق ہے۔ اعتقادات اور تصورات بڑے ہی جاندار، حرکت انگیز اور اثر آفریں ہوتے ہیں۔ ان کا جب بھی اجتماع کیا جائے تو ان میں فوراً کشمکش شروع ہو جاتی ہے اور وہ اس وقت تک

چین نہیں لیتے جب تک کہ مخالف عناصر کو فتح کر کے انہیں اپنے رنگ میں رنگ نہ لیں۔ یا پھر وہ مفتوح ہو کر ان میں بالکل مدغم نہ ہو جائیں۔ اس لیے مادیت کے ساتھ جب بھی روحانیت یا اخلاق کا پیوند لگایا جائیگا تو اس کی عملی صورت یہی ہو گی کہ روحانیت بھی مادیت کا روپ دھار لیگی۔ اگر کسی کو اس معاملے میں تردد ہو تو وہ اسلامی ممالک میں متجددین کے کارناموں پر ایک نظر ڈالے اور دیکھے کہ جن نظریات و افکار کو یہ لوگ اسلام کی تعبیر جدید کہتے ہیں کیا وہ ایک خالص اخلاقی اور روحانی مذہب کی مادی تعبیر نہیں۔ یہ حضرات بھی اپنی زندگی کے مسائل کا حل اُسی طرز پر کرنا چاہتے ہیں جس طرح کہ مادیت پر ایمان لانے والے اہل یورپ برسوں سے کر رہے ہیں۔ پچھلے سال پنجاب یونیورسٹی میں جو کلوکیم ہوا اس میں غیر مسلم مستشرقین اور اُن کے مسلمان مقلدین نے اسلام کے متعلق جن خیالات کا اظہار کیا وہ سب اسی طرز فکر کی غمازی کر رہے تھے۔

بیجا نہ ہو گا کہ اگر ہم اس مرحلہ پر اس حقیقت کی طرف بھی اشارہ کر دیں کہ اس قسم کی بیکار کوششیں سب سے زیادہ خود اسلام کے ماننے والے دین حنیف کے معاملے میں کر رہے ہیں۔ چونکہ اسلام انسان کی مادی زندگی سے بھی بحث کرتا ہے اس لیے یہ لوگ سمجھتے ہیں کہ اس دین کے اندر مادیت اور روحانیت کا اجتماع آسانی سے کیا جا سکتا ہے۔ اسلام نے مادیت اور روحانیت کے مابین تناسب کا جو رشتہ قائم کر رکھا ہے اُسے یہ کہہ کر توڑنے کی کوشش کی جا رہی ہے کہ یہ وقت کے تقاضوں کا متحمل نہیں رہا اس لیے اسے منقطع کر کے جدید ضروریات کے مطابق پھر سے اُستوار کیا جائے۔ لیکن یہ حضرات اپنے علم و فضل کے بڑے بلند بانگ دعووں کے باوجود اس بات کو سمجھنے سے قاصر ہیں کہ مادیت اور روحانیت کا جوڑ اوّل تو یوں ہی مشکل ہے مگر اسلام کے دائرہ کے اندر تو اُس کی بالکل کوئی گنجائش نہیں پائی جاتی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اسلام نے انسان کو نہ صرف چند عقائد اور عبادات دی ہیں بلکہ اخلاقی اقدار کا ایک ایسا ہمہ گیر نظام بھی دیا ہے جس سے ہم زندگی کے کسی گوشے میں بھی آزاد نہیں ہو سکتے وہ روحانی اور معنوی نقطۂ نظر جو ہم مابعد الطبیعی مسائل میں رکھتے

ہیں وہ نہ صرف ہمارے اعمال میں منعکس ہوتا ہے بلکہ ہماری پوری زندگی ۔۔ انفرادی ہو یا اجتماعی ۔ سب کا احاطہ کیے ہوئے ہے ۔ روحانیت یا اخلاق کے اس ہمہ گیر اور کلیت پسند نظام میں آخر مادیت کس طرح راہ پا سکتی ہے ۔ ہماری زندگی کے جن گوشوں کو یہ سطح بیں لوگ مادی یا دنیاوی خیال کرتے ہیں انہیں اسلام نے اخلاقی اقدار کے تسلط میں دیکر روحانی ترقی کے لیے زینے بنایا ہے ۔ اسلام سراسر ایک روحانی اور اخلاقی دین ہے جس میں مادی فلسفۂ حیات کے لیے کوئی جگہ نہیں ۔ البتہ اس میں اور دوسرے مذاہب میں جو کچھ فرق ہے وہ یہ کہ اس نے نہ تو مادیت کے ہاتھوں شکست کھا کر لوگوں کو بدھ مت کی طرح رہبانیت کی تعلیم دی ہے اور نہ ہی زندگی کی فطری وحدت کو منتشر کر کے اُسے خدا اور قیصر کے دو مختلف حصوں میں تقسیم کیا ہے بلکہ ایک غالب اور زبردست قوت کی حیثیت سے اس نے زندگی کے سارے شعبوں کو خواہ اُن کا تعلق امورِ دنیا سے ہو یا امورِ آخرت سے اخلاق اور روحانیت میں رنگ کر انہیں ایک فطری وحدت بنا دیا ہے ۔

اوپر کی ان گذارشات سے یہ حقیقت پوری طرح منکشف ہو گئی ہو گی کہ اسلام میں مادیت اور روحانیت کے اجتماع کی کوئی راہ نہیں نکالی جا سکتی ۔ باقی رہے دوسرے مذاہب خصوصاً عیسائیت یا بدھ مت تو ان میں بھی معاملہ اتنا آسان نہیں جتنا کہ بظاہر نظر آتا ہے ۔ اس کی وجہ یہ ہے اضداد کے اجتماع سے جو فلسفہ زندگی یا نظریہ حیات تشکیل پاتا ہے اُس کو اپنانا بہت مشکل ہے ۔ اس سے انسان کے ذہن میں ایک ایسی کشمکش شروع ہو جاتی ہے جو اسے کہیں کا بھی نہیں چھوڑتی ۔ اُس کے اندر ساری تخلیقی قوتیں ختم ہو جاتی ہیں اور وہ بیچارا خارجی ماحول سے نبرد آزما ہونے کی بجائے خود اپنے آپ سے ہی جنگ کرنا شروع کر دیتا ہے ۔ یہ صورتِ حال سب سے زیادہ خطرناک اور انسانیت کے لیے سب سے زیادہ مہلک ہے ۔ اور اس پر نوعِ بشری تھوڑی سی تھوڑی مدت کے لیے بھی قائم نہیں رہ سکتی ۔ زندگی کی فطری وحدت اس سے ہر آن تقاضا کرتی ہے کہ وہ اساسی نظریۂ حیات کے معاملے میں یکسو ہو جائے ۔ اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ یا تو وہ مادیت کی طرف جھک کر بالکل ایک

دنیا پرست انسان کی سی زندگی بسر کرتا ہے جس میں روحانیت اور اخلاق کا کوئی معمولی سے معمولی شائبہ بھی نہیں ہوتا، یا پھر انسان خیگاہِ حیات میں شکست کھا کر ایک راہب کی حیثیت سے امورِ دنیا سے بالکل بے تعلق ہو جاتا ہے۔ ان دونوں صورتوں کے علاوہ تیسری کوئی صورت ممکن نہیں۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ یورپ اور امریکہ کے جن حصوں میں مذہب اور اخلاق کا احساس ابھرنے لگا ہے وہاں لوگ بدھ مت اور بہائی ازم کی طرف متوجہ ہوئے ہیں اور انھوں نے زندگی کے مسائل سے فرار اختیار کرنے میں ہی اپنی اور پوری انسانیت کی عافیت سمجھی ہے۔

یہ صورت کوئی ایسی نہیں جس پر اطمینان کا اظہار کیا جا سکے۔ انسانیت کے لیے یہ بھی اسی طرح سمِ قاتل ہے جس طرح کہ مادیت۔ بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ یہ مادیت سے زیادہ خطرناک اور نقصان دہ ہے تو یہ زیادہ صحیح ہوگا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مادیت ہزار نقائص کے باوجود اپنے اندر ایک اجتماعی زندگی یا تمدن کی تعمیر کی صلاحیت رکھتی ہے۔ لیکن اس قسم کی نرم و نازک اور ناتواں روحانیت کے بل بوتے پر کسی محدود سے محدود رقبۂ زمین میں بھی کوئی تمدنی زندگی ظہور میں نہیں آسکتی۔

اس کے علاوہ مادیت اور روحانیت کے اس غیر فطری انضمام کا ایک لازمی نتیجہ یہ بھی برآمد ہوتا ہے کہ پوری انسانی سوسائٹی دنیا پرستوں اور دینداروں کے درمیان بٹ جاتی ہے۔ دنیا پرست ہر قسم کی اخلاقی حدود سے آزاد ہو کر دنیاوی فوائد و لذائذ سے بھرپور متمتع ہوتے ہیں۔ ان کی ہوس رانی میں کوئی چیز بھی مانع نہیں ہونے پاتی۔ وہ اپنی نفسانی خواہشات کے مطابق جس طرح چاہتے ہیں حیاتِ انسانی کا اجتماعی ڈھانچہ تیار کرتے ہیں۔ تہذیب و تمدن، معیشت و معاشرت، اخلاق و قانون، الغرض انسان کی پوری زندگی کی تعمیر مادیت پر کی جاتی ہے مگر اس کے ساتھ ساتھ صحراؤں اور ویرانوں میں زہد اور تقویٰ پرورش پاتا ہے۔ تاریخ کے اوراق اس حقیقت کے پوری طرح شاہد ہیں۔ مادہ پرست رومیوں کے ہاں جس وقت عیسائیت کو عروج ہوا اس وقت ان میں بہ یک وقت عصبیت و آزادی اور زہد و رہبانیت کی دو متقابل تحریکیں دوش بدوش چلنے لگیں۔ خدا خوفی اور خدا ترسی تو

انسانی آبادیوں سے بہت دُور پہاڑوں اور جنگلوں میں معتکف تھی اور فسق و فجور بڑی آزادی کے ساتھ شہروں میں دندناتا پھر رہا تھا۔ خدا سے ڈرنے والے لوگ راہبانہ شغل و ذکر اور زاہدانہ تعبد و استہلاک میں اس بُری طرح مشغول تھے کہ انہیں نہ تو اپنے حقوق و فرائض کا ہوش تھا اور نہ ہی اپنے ابنائے جنس کی ضرورتوں کا احساس۔ اس موقع سے پوری طرح فائدہ اٹھاتے ہوئے دنیاداروں نے بلا روک ٹوک پوری زندگی پر تسلط قائم کر لیا اور یہ راہب بڑی خاموشی کے ساتھ اپنے نفوس کا تزکیہ کرنے میں مصروف رہے۔ زندگی کے ہر میدان میں نا انصافی، رشوت خواری اور دغابازی کا بازار گرم تھا مگر کسی متقی کے کان پر جُوں تک نہ رینگتی۔ ظالم حاکموں کے ستائے ہوئے لوگوں کی فریاد آسمانوں تک پہنچ رہی تھی مگر کوئی زاہد ان سے متاثر نہ ہوتا۔ ان نیک اور پاکباز لوگوں کی ساری دلچسپیاں صرف اپنی تربیت کرنے تک محدود تھیں۔ دنیا اور اس سے متعلقہ امور سارے کے سارے نہایت ہی بددیانت اور ذلیل قسم کے لوگوں کے ہاتھوں میں تھے۔ وہ جس طرح چاہتے معاملات کو طے کرتے اور کوئی ان پر گرفت کرنے والا نہ ہوتا۔ چنانچہ مادیت اور روحانیت کے اختلاط کے اس تجربہ کو اگر اب بھی دہرایا گیا تو اس سے اسی قسم کے افسوسناک نتائج ظہور میں آئیں گے جو انسانیت کے لیے کسی جہت سے بھی سودمند نہیں ہو سکتے۔

اس ضمن میں اس حقیقت کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ کسی نظامِ حیات کی قوت اُس کے عناصر میں ظہورِ ترتیب کا فطری نتیجہ ہوتی ہے اور اگر ان اجزا کو پریشان کر کے انہیں کسی دوسرے نظام کے اجزا سے جوڑ دیا جائے تو اس سے جو نئی وحدت معرضِ وجود میں آئے گی اُس میں ممکن ہے ایک دلکشی یا جاذبیت ہو مگر وہ ہر قسم کی تخلیقی قوت سے یکسر عاری ہو گی کیونکہ جو چیز کسی نظامِ حیات کو زندگی بخشتی ہے اُس کا انحصار اُس رشتۂ تناسب پر ہوتا ہے جو وہ نظام اپنے ہی مختلف اجزا کے درمیان قائم کرتا ہے۔ یہی درحقیقت کسی نظام کی جان ہے اور اگر اسے منتشر کر دیا جاتے تو پھر کوئی نظامِ حیات ایک لمحہ بھر کے لیے زندہ نہیں رہ سکتا۔ مادیت ہزار

خامیوں کے باوجود صرف اس لیے ایک زندہ قوت ہے کہ اُس نے حیاتِ انسانی کے مختلف شعبوں کو باہم ایک دوسرے سے اس طرح مربوط کیا ہے کہ ان میں ایک فکری اور عملی وحدت نظر آتی ہے یہاں ایک ہی نقطۂ نظر ہے جس نے افکار و اعمال کے تنوع میں ہم آہنگی پیدا کر رکھی ہے۔ اگر یہ نقطۂ نظر ختم ہو جائے تو پوری زندگی زیر و زبر ہو جاتی ہے۔ مغلیہ عہد میں اکبر نے اسی قسم کی ایک حماقت کو کامیاب بنانے کے لیے کیا کچھ نہیں کیا تھا۔ مگر تاریخ میں اس "احمقانہ کوشش" کا جو حشر ہوا وہ کسی صاحبِ نظر سے پوشیدہ نہیں۔

انسانیت جس اخلاق اور روحانیت کی آج متلاشی ہے اور جس کے پالینے پر اُس کی نجات کا انحصار ہے وہ نہ تو ایک آدم بیزار رہبانیت ہے، اور نہ ہی چند مخفی طاقتوں کی پرورش و ترقی اور ان کے عجائب اور شعبدوں کا مظاہرہ ہے جو مسمریزم کی طرح ایک مرتبہ فن اور صنعت بن گیا ہے۔ پھر انسان کے لیے وہ اخلاق اور روحانیت بھی کچھ زیادہ مفید اور کارآمد نہیں ہو سکتی جو اصلاحِ باطن سے آگے بڑھنے نہ پائے، جو زندگی کے صرف ایک گوشے کو متاثر کرنے پر قناعت کرے اور حیاتِ انسانی کے باقی شعبوں سے از خود دستبردار ہو جانے ہی میں اپنی عافیت سمجھے۔ آج زندگی میں سائنس کی ایجادات نے ایک زبردست قوت اور طاقت پیدا کر دی ہے۔ اس لیے ہمارے اس دور میں وہی اخلاق یا روحانیت انسانیت کو تباہی سے بچا سکتی ہے جس میں زندگی کے مختلف شعبوں کو اخلاقی سانچوں میں ڈھالنے کی حیرت انگیز صلاحیت ہو جس کے اندر اگر ایک طرف اصلاحِ باطن کا عمدہ پروگرام موجود ہو تو دوسری طرف وہ ایک ایسا خارجی نظام بھی پیش کرے جس سے لوگ اخلاق اور اخلاقی اقدار کی بآسانی پابندی کر سکیں۔ آج ہمیں صرف اخلاقی مواعظ و نصائح درکار نہیں بلکہ اخلاق کا ایک پورا نظامِ فکر و عمل مطلوب ہے جو ہماری پوری زندگی سے مادی فلسفۂ حیات کی عملداری کو یکسر ختم کر کے وہاں اخلاق اور اخلاقی اقدار کی فرمانروائی قائم کرے، جس میں تخلیق کی ایک زبردست قوت موجود ہو۔ ایک ایسی قوت جس کی مدد سے نوعِ بشر، روحانیت کی ایک دنیا آباد کر سکے۔

اسلام ہی دنیا کا وہ واحد نظامِ اخلاق ہے جو ان تمام شرائط کی تکمیل کر سکتا ہے جن کا تذکرہ اوپر کیا جا چکا ہے۔ یہ اُن معنوں میں کوئی مذہب نہیں جن معنوں میں کہ یہ لفظ عام طور پر بولا جاتا ہے۔ یہ ایک ہمہ گیر دین ہے جو اخلاق کی بنیاد پر پوری زندگی کی تعمیر کرتا ہے۔ اس کا کمال یہ ہے کہ اس نے اپنی زبردست اخلاقی قوت کے ذریعے زندگی کے اُن شعبوں کو جو سراسر مادی ہیں، روحانی بنا دیا ہے۔ اس کے علاوہ آپ جس کسی دوسرے مذہب کا مطالعہ کریں گے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ اس میں دین و دنیا دو الگ کارخانے ہیں جن کے درمیان کوئی ربط نہیں پایا جاتا۔ دین اخلاق اور روحانیت سے بحث کرتا ہے اور دنیا انسان کی مادی زندگی سے تعلق رکھتی ہے۔ اسے اسلام کا اعجاز کہیے اور انسانیت پر احسانِ عظیم سمجھیے کہ اُس نے دین اور دنیا کی دوئی کو مٹا کر ایک نظامِ فکر و عمل کو جنم دیا ہے۔ وہ جب امورِ دنیا کا تذکرہ کرتا ہے تو یوں معلوم ہوتا ہے کہ وہ سب خالص روحانی چیزیں ہیں اور اس کے برعکس جب تزکیۂ نفس یا اصلاحِ باطن کا پروگرام سامنے لاتا ہے، تو دیکھنے والا یوں محسوس کرتا ہے کہ یہ تو محض "دنیاداری" ہے۔ دین و دنیا کی اس تفریق کو ختم کر کے انہیں ایک اخلاقی یا روحانی وحدت بنا دینا اسلام کے معجزات میں سے ایک بہت بڑا معجزہ ہے۔ اس نظام میں ایک ایسی زبردست تخلیقی قوت موجود ہے جو ہر چیلنج کا کامیابی کے ساتھ جواب دے سکتی ہے۔

مگر اس سے کہیں یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ اب انسانیت لازمی طور پر خود آگے بڑھ کر اسلام کو بطورِ ایک نظامِ حیات کے قبول کر لیگی۔ انسانی تاریخ میں جبر کا کوئی ایسا عنصر نہیں پایا جاتا جو انسانوں کو کسی خاص راستہ پر گامزن کرنے پر مجبور کر دے۔ آدمی بسا اوقات جبلی طور پر بعض حقائق کو محسوس تو کرتا ہے مگر انہیں اس وقت تک تسلیم کرنے پر آمادہ نہیں ہوتا جب تک کہ وہ انہیں ان کے ماننے والوں کے سیرت و کردار اور عمل میں جلوہ گر نہیں دیکھ لیتا۔ آیا انسانیت اسلام کو قبول کر کے اپنے دکھوں کا مداوا کرنے میں کامیاب ہوتی ہے یا ناکام، اس کا دارومدار اگر ایک طرف اسلام کے بارے میں انسانیت کے طرزِ عمل پر ہے تو دوسری طرف اس کا فیصلہ خود مسلمانوں کی اسلام سے وابستگی پر بھی موقوف ہے۔